ایٹمی جنگ

(تین افسانے)

حیدر قریشی

معیار پبلی کیشنز

ATMI JANG

(Three Short Stories)

By: Haider Qureshi

نام کتاب:	ایٹمی جنگ (تین افسانے)
مصنف:	حیدر قریشی
کمپوزنگ، ڈیزائننگ:	محمد عمر کیرانوی
اشاعت:	1999ء
مطبع:	عزیز پرنٹنگ پریس، نئی دہلی
قیمت:	چالیس روپے

معیار پبلی کیشنز

کے۔۳۰۲/تاج انکلیو، گیتا کالونی، نئی دہلی۔۱۰۰۳۱ (انڈیا)

ترتیب

تین افسانے

انتساب

اپنے ماموں
پروفیسر ناصر احمد (مرحوم) کے نام

حیدؔر نے پہچان کے تجھ کو، جانا تیرا بھید
''بلھے شاہ اساں مرنا ناہیں، گور پئے کوئی ہور''

جو پھونک دیں تو قیامت ہی اک اُٹھائے گا
چھپا ہوا کوئی ایٹم کا صُور خاک میں ہے

ایٹمی جنگ کا خطرہ

(افسانوی مجموعہ ''ایٹمی جنگ'' کا پیش لفظ)

کل تک برِصغیر کے باشندوں کی بڑی اکثریت عالمی سطح پر ایٹمی جنگ کے کسی امکان سے بھی بے خبر یا بے نیاز تھی۔لیکن اس برس پہلے انڈیا نے اور پھر پاکستان نے ایٹمی دھماکے کر کے برصغیر کے عام آدمی کو بھی ایٹمی جنگ کی تباہ کاری سے باخبر کر دیا ہے۔انڈیا اور پاکستان نے ایٹمی دھماکے نہ کیے ہوتے ،تب بھی یہ حقیقت ہے کہ پوری دنیا ایٹمی بارود کے ڈھیر پر بیٹھی ہوئی ہے۔اب اس بارود میں مٹھی بھر اضافہ ہوا ہے۔دنیا کی بڑی اور ایٹمی طاقتوں کے پاس ایٹمی اسلحہ کا جو ذخیرہ موجود ہے،ایک محتاط اندازے کے مطابق اس پورے کرّہ ٴارض کو پانچ بار فنا کرنے کے لیے کافی ہے۔سوویت یونین کی شکست وریخت سے سرد جنگ کا خاتمہ ہوا ہے☆لیکن ایٹمی اسلحہ تو بدستور موجود ہے۔ایٹمی میزائلوں کا کمپیوٹرائز ڈسسٹم کبھی کسی فنی خرابی کا شکار ہو گیا تو یہ فنی خرابی بھی پوری دنیا کی بربادی کا باعث بن سکتی ہے۔لیکن کل تک ہم لوگوں کی بھاری اکثریت اس خطرے کے ادراک سے بے خبر تھی۔بے شک بے خبری ایک نعمت ہے۔

۱۹۸۰ء کے وسط میں میرا ذہن بار بار ایٹمی جنگ کے امکانی خطرہ کی طرف جاتا تھا۔بعض آسمانی صحیفوں اور مذہبی کتب میں مجھے ایک بڑی تباہی کی خبریں پڑھنے کو ملیں تو میرے اندر کی بے چینی نے مجھ سے کہانی ''حوّا کی تلاش'' لکھوائی۔اس میں ایٹمی جنگ کے بعد کی فضا کو آسمانی صحیفوں اور مذہبی کتب کی روشنی میں دیکھنے کی کاوش تھی۔میری یہ خواہش کہ میں رہوں نہ رہوں،نسلِ آدم اس دھرتی پر آباد رہنی چاہئے،اس کہانی میں کہانی کے تقاضے کے مطابق آئی

تھی۔اس میں ایک ہلکا سا سیاسی اشارہ بھی تھا۔
عربوں کی تیل کی دولت کے لالچ میں بڑی طاقتوں کا ٹکراؤ اور دونوں کی تباہی۔

''حوّا کی تلاش''مجلّہ ''اوراق''لاہور شمارہ فروری،مارچ ۱۹۸۱ء میں شائع ہوئی۔متعدد ادیبوں نے اس کہانی کو پسند کیا۔چونکہ اس کہانی میں ایک سیاسی اشارہ موجود تھا،چنانچہ بعد میں ایک اور کہانی لکھی گئی ''گلاب شہزادے کی کہانی''۔اس کہانی کے بعض معاشرتی پہلوؤں سے قطع نظر،یہ بنیادی طور انسانی حرص و ہوس کو نمایاں کر کے تیل کے چشمے پر انسانیت کے دَم توڑنے کی نیم علامتی کہانی تھی۔اس میں بھی ایٹمی جنگ کے بعد کی امکانی صورتحال کو ظاہر کیا گیا تھا۔''حوّا کی تلاش'' کا اختتام پُر امید تھا جبکہ ''گلاب شہزادے کی کہانی'' کا انجام تلخ حقائق کے پیش نظر مایوس کن تھا۔''گلاب شہزادے کی کہانی''،''اوراق''کے شمارہ اپریل مئی ۱۹۸۲ء میں شائع ہوئی

میری ان دونوں کہانیوں کے حوالے سے بعض دوستوں نے مجھ سے سوال کیا کہ ایٹمی جنگ کے بعد سطح زمین پر کسی ذی روح کا زندہ بچ رہنا ممکن نہیں ہے،لہٰذا ''حوّا کی تلاش'' اور ''گلاب شہزادے کی کہانی''میں جو لوگ ایٹمی تباہ کاری کے باوجود زندہ بچ گئے ہیں انہیں کس بنیاد پر بچایا گیا ہے؟

دوستوں کے اس سوال نے مجھے سائنسی تناظر میں سوچنے کا موقعہ عطا کیا۔اس غور و فکر نے مجھے مذہبی اور سیاسی پہلوؤں سے ہٹ کر سائنسی بنیادوں پر کہانی لکھنے کی ترغیب دی،تاہم میں نے کہانی لکھنے میں جلدی نہیں کی۔کہانی میرے اندر بنتی رہی اور پہلی کہانی سے لگ بھگ گیارہ سال کے بعد ''کاکروچ'' لکھی گئی۔یہ کہانی ماہنامہ ''صریر'' کراچی شمارہ فروری ۱۹۹۲ء میں شائع ہوئی۔

''حوّا کی تلاش''،''گلاب شہزادے کی کہانی'' اور ''کاکروچ''۔۔۔یہ تینوں کہانیاں کرّہ ٴارض پر انسانیت کو درپیش ایٹمی تباہی کے بارے میں میرے احساس اور میری تشویش کی کہانیاں ہیں۔ایسے وقت میں جب برِصغیر کے عوام کو بھی اس ہولناک تباہی کا اندازہ ہو گیا ہے،میں اپنی تینوں کہانیاں ایک ساتھ پیش کر رہا ہوں۔انڈیا اور پاکستان کے ایٹمی دھماکوں کے

سیاسی پس منظر سے قطع نظر، میرے لیے یہ نئی صورتحال قدرے اطمینان کا موجب بن رہی ہے کہ دونوں طرف یہ احساس ہونے لگا ہے کہ کسی ایک کی ہلاکت کا مطلب لازمی طور پر دوسرے کی بھی ہلاکت ہے۔اس بات کو اچھے انداز میں کہا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ انڈیا اور پاکستان کا جینا مرنا اب ساتھ ساتھ ہے۔غور کریں تو یہ ساتھ جینا اور ساتھ مرنا تو محبت کا مقام ہے۔تو پھر کیوں نہ ہم سب مل کر محبت کے اس مقام کو پہچانیں!

انسان کی انسان سے محبت کو صرف برِ صغیر تک ہی کیوں محدود رکھا جائے۔کرّۂ ارض، اس بے پناہ کائنات میں ایک بے حد چھوٹی سی دنیا ہے۔اس دنیا میں ساری جغرافیائی اکائیاں اپنی اپنی جگہ ایک سچ ہیں۔لیکن کرّۂ ارض خود ایک بڑی جغرافیائی اکائی بھی ہے۔اس دھرتی کے سارے انسان اپنے قومیتی، علاقائی اور مذہبی تشخص کے ساتھ۔۔۔اپنے اپنے تشخص کو قائم رکھتے ہوئے پوری دھرتی کو ایک ملک بنالیں اور اس ملک کے باشندے کہلانے میں خوشی محسوس کرنے لگیں تو شاید ایٹمی جنگ کے سارے خطرات ختم ہو جائیں۔لیکن کیا ایسا ممکن ہے؟

پوری دھرتی کو ایک ملک بنانے کا خواب اور وحدتِ انسانی کی آرزو شاید بہت دور کی منزل ہے۔یہ دوری قائم رہے یا ختم ہو جائے، اس کا انحصار تو ساری دنیا کے ملکوں کے باہمی اعتماد اور یقین پر ہے۔ایک عام آدمی کے لیے شاید یہ کسی دیوانے کا خواب ہو، پھر بھی آیئے ہم سب مل کر دعا کریں۔

دنیا میں محبت کے فروغ کی دعا!

دھرتی پر نسلِ انسانی کے قائم رہنے کی دعا!

حیدر قریشی

(۱۲رجولائی ۱۹۹۸ء)

حوّا کی تلاش

مِرے بدن پہ ترے وصل کے گلاب لگے
یہ میری آنکھوں میں کس رُت میں کیسے خواب لگے

مجھے یقین نہیں آ رہا۔
میں عالمِ برزخ میں ہوں،
عالمِ خواب میں ہوں،
یا عالمِ حقیقت میں ہوں؟

''غالباً میں عالمِ حقیقت میں ہوں'' کسی وہم کی طرح مجھے یقین ہو جاتا ہے اور میں اٹھ کر بیٹھ جاتا ہوں۔تھوڑی دیر بیٹھا رہتا ہوں پھر اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہوں۔

میرا مستقبل میرے داہنے ہاتھ پر اور میرا ماضی میرے بائیں ہاتھ پر ہمیشہ رقم رہتا تھا اور میں اپنے ماضی اور مستقبل کی تحریروں کو پڑھتے ہوئے ہمیشہ حال میں رواں رہتا تھا۔مگر اب میں نے اپنے دائیں ہاتھ کی تحریر پڑھنا چاہی تو مجھے وہاں چاروں طرف دھند چھائی ہوئی نظر آئی۔میں نے اپنے بائیں ہاتھ کی تحریر پڑھنا چاہی تو وہاں دھواں دھواں فضاؤں کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔بے چارگی کے احساس کے ساتھ میں نے اپنے حال کی طرف دیکھنا چاہا تو مستقبل کی ساری دھند میری

آنکھوں میں اُتر آئی اور ماضی کا سارا دھواں میرے چاروں طرف رقص کرنے لگا۔اس عذاب
ناک حالت میں مجھے بچپن کی وہ دعائیں بھی بھول گئیں جو میری ماں نے مجھے یاد کرائی تھیں۔لیکن
میں مایوس نہیں ہوا۔آخر دھوئیں کا رقص دھواں ہونے لگا۔روشنی کی ایک لکیر ابھری اور ابھرتی چلی
گئی،

"الم ترکیف فعل ربك با اصحاب الفیل"

دھند میری آنکھوں سے چھٹنے لگی اور دھواں دور ہٹنے لگا۔ مجھے اصحاب فیل کا انجام یاد
آیا جو کھائے ہوئے بھوسے کی مانند ہوگئے تھے۔ میں نے اپنے سامنے بکھرے ہوئے ایٹم بم
کا شکار ہونے والے منظر کو دیکھا اور مجھے اصحاب فیل کی خوش قسمتی پر رشک آنے لگا جو صرف
کھائے ہوئے بھوسے کی مانند کر دیئے گئے تھے۔

عالمگیر ایٹمی جنگ ہو چکی ہے اور میں پتہ نہیں کیسے زندہ بچ گیا ہوں۔میرے چاروں طرف
اس بھیانک جنگ کے اندھیرے پھیلے ہوئے ہیں۔ مجھے ان اندھیروں سے نکلنے کے لئے روشنی
درکار ہے۔اور تب ہی جس قوت نے مجھے اس جنگ میں بھی زندہ رکھا تھا۔ مجھے روشنی عطا کرنی
شروع کر دی۔روشنی کی جو لکیر پہلے ابھری تھی وہ اب ایک روشن ہالے کی شکل اختیار کر گئی ہے اور
مجھ پر کرن کرن اتر رہی ہے،

"تجھے کیا معلوم ہے کہ حطم (ایٹم) کیا شے ہے؟ یہ اللہ کی خوب بھڑکائی ہوئی آگ
ہے جو دلوں کے اندر تک جا پہنچے گی تا کہ اس کی گرمی ان کو اور بھی زیادہ تکلیف دہ محسوس ہو"

"دنیا پر ایک شدید مصیبت آنے والی ہے اور تجھے کیا معلوم ہے کہ وہ مصیبت کیسی
ہے؟ اور ہم پھر کہتے ہیں کہ اے مخاطب! تجھے کیا معلوم ہے کہ یہ عظیم الشان مصیبت کیا چیز ہے؟ یہ
مصیبت جب آئے گی تو اس وقت لوگ پراگندہ پروانوں کی طرح ہوں گے اور پہاڑ اس پشم کی
مانند ہو جائیں گے جو دھنکی ہوتی ہے۔"

"جب زمین کو پوری طرح ہلا دیا جائے گا۔اور زمین اپنے بوجھ نکال کر پھینک دے گی
اور انسان کہہ اٹھے گا کہ اسے کیا ہو گیا ہے؟"

مجھے یاد آتا ہے کہ میں ایک پہاڑی علاقہ میں ٹھہرا ہوا تھا جب ایٹمی جنگ چشم زدن میں
چھڑ گئی تھی مگر اب کہیں بھی کوئی پہاڑ نظر نہیں آرہا۔ میں خود ہی حیرت سے پکار اٹھتا ہوں" یہ کیا
ہو گیا ہے؟" اور قرآن کی صداقت کا ایک گواہ بن جاتا ہوں۔

مجھے یاد آتا ہے۔دو بڑی قوتیں ساری دنیا پر پھیل رہی تھیں۔ان میں مشرقی قوت کا
جال زیادہ پھیلا ہوا تھا لیکن مغربی قوت بھی کم نہ تھی۔عجیب عجیب نعرے تھے۔عجیب عجیب نظریات
تھے۔دونوں ہی انسانیت کی فلاح کی باتیں کرتے تھے اور اب دونوں ہی انسانیت کی تباہی کا
موجب ہو گئے تھے جنگ کی ابتدا مشرقِ وسطیٰ سے ہوئی تھی۔وہاں کی تیل کی دولت۔ جسے دونوں
بڑی قوتیں للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتی تھیں۔پھر کیا ہوا؟۔۔ مجھے واقعات کا علم نہیں۔لیکن روشنی
کا جو ہالہ مجھ پر کرن کرن اتر رہا ہے وہ مجھے بتانے لگتا ہے۔اس کا اپنا انداز بیان ہے۔

"خداوند کہتا ہے کہ میں نے اپنی غیرت سے اور قہر کی آتش سے کہا یقیناً اسی دن
اسرائیل کی سرزمین میں ایک زلزلہ ہوگا۔ یہاں تک کہ سمندر کی مچھلیاں اور آسمان کے پرندے اور
زمین کے چرندے اور سارے کیڑے مکوڑے جو زمین پر رینگتے پھرتے ہیں اور سارے انسان جو
روئے زمین پر ہیں میرے سامنے تھرتھرا جائیں گے اور پہاڑ اٹھائے جائیں گے اور کڑاڑے بیٹھ
جائیں گے اور ہر ایک دیوار زمین پر گر پڑے گی.....ایک شدت کا مینہ اور بڑے بڑے اولے اور
آگ اور گندھک برساؤں گا۔اسی طرح میں اپنی بزرگی اور تقدیس کراؤں گا اور بہتیری قوموں کی
نظروں میں پہچانا جاؤں گا اور وہ جانیں گے کہ خداوند میں ہوں"

"دیکھ میں ترا مخالف ہوں اے جوج روش اور مسک اور توبال کے سردار! میں تجھے پلٹ
دوں گا..اور میں تجھے ہر قسم کے شکاری پرندوں اور میدان کے درندوں کو خوراک کے لئے دوں
گا۔تو کھلے ہوئے میدان میں گر پڑے گا.....اور میں ماجوج پر اور ان پر جو جزیروں میں بے
پروائی سے سکونت کرتے ہیں ایک آگ بھیجوں گا.......اور آگے کو میں ہونے نہ دوں گا کہ وہ
میرے پاک نام کو بے حرمت کریں"

"اور دنیا میں ایک حشر برپا ہو جائے گا اور وہ اول الحشر ہوگا اور تمام بادشاہ آپس میں ایک

دوسرے پر چڑھائی کریں گے اور ایسا کشت وخون ہوگا کہ زمین خون سے بھر جائے گی اور ہر ایک بادشاہ کی رعایا بھی آپس میں خوفناک لڑائی لڑے گی۔ ایک عالمگیر تباہی آوے گی اور ان تمام واقعات کا مرکز ملک شام ہوگا''

''اے یورپ تو بھی امن میں نہیں اور اے ایشیا تو بھی محفوظ نہیں اور اے جزائر کے رہنے والو! کوئی مصنوعی خدا تمہاری مدد نہیں کرے گا۔ میں شہروں کو گرتے دیکھتا ہوں اور آبادیوں کو ویران پاتا ہوں''

میں خدا کی بزرگی اور تقدیس کا اقرار اور اپنے عجز کا اعتراف کرتا ہوں۔ روشنی کی کرنیں میرے جسم پر تو اُتر رہی ہیں مگر روح تک نہیں پہنچ پاتیں۔ شاید اسی وجہ سے میں صرف اپنے ماضی کی تحریریں ہی پڑھ سکا ہوں۔ مستقبل کی تحریروں کی یا تو زبان بدل گئی ہے یا اُنہیں پڑھنے کی میری قوت سلب ہوگئی ہے

ایٹمی جنگ نے آدم کی نسل کو صفحہ ہستی سے نیست و نابود کر دیا ہے اور اب ابن آدم ہونے کے ناطے اس وقت مجھے اپنا سب سے پہلا فریضہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو آدم کی نسل کو اس دھرتی پر قائم رکھا جائے۔ شاید میں اس نئے عہد کا آدم ہوں۔

مگر نئی حوا۔۔۔۔؟

میں خدا کی تسبیح وتحمید کرتے ہوئے نئی حوا کی تلاش کے سفر پر روانہ ہوتا ہوں راستے میں تباہیوں کے کئی بھیانک منظر آتے ہیں۔ روشنی کا وہ ہالہ میرے ساتھ ہے اور اب بھی کرن کرن میرے جسم پر اتر رہا ہے۔ میرا نامعلوم اور اَن دیکھا سفر جاری ہے۔ ایک جگہ تو تباہی کا ایسا منظر آتا ہے جیسے یہاں ایک دم بیسیوں ایٹم بم گرا دیئے گئے ہوں میں خوف زدہ ہو جاتا ہوں۔ اور اس منظر سے چھپنے کے لئے اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔

تب ہی روشنی کے ہالے کی کرنیں میری آنکھیں کھول دیتی ہیں،

''کیا یہ زمین میں نہیں پھرے کہ دیکھتے کہ ان سے پہلوں کا کیا انجام ہوا؟ وہ ملک میں ان سے تعداد اور طاقت میں بھی زیادہ تھے اور عمارت وغیرہ کے فنون میں بھی زیادہ ماہر تھے۔

لیکن ان کے اعمال نے ان کو کوئی نفع نہیں دیا تھا۔ اور جب ان کے پاس ان کے رسول نشانات لے کر آئے تو ان کے پاس جو تھوڑا بہت علم تھا اس پر فخر کرنے لگے اور جس عذاب کی ہنسی اُڑاتے تھے اسی نے ان کو گھیر لیا۔ پھر جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھا تو کہہ اٹھے ہم تو اللہ کو ایک قرار دیتے ہوئے اس پر ایمان لاتے ہیں اور اس کے ساتھ جن چیزوں کو ہم شریک قرار دیا کرتے تھے ان کا ہم انکار کرتے ہیں۔ پس جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا تو ان کے ایمان نے ان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔ یہی اللہ کی مقررہ سنّت ہے جو اس کے بندوں میں جاری چلی آتی ہے''۔

میں تہیہ کرتا ہوں کہ مجھ آدم سے جو نسل چلے گی اسے میں ان صحیفوں کی تعلیمات کے مطابق خود تربیت دوں گا اور میری نسل شیطان کے چنگل میں دوبارہ اس طرح نہیں آئے گی کہ خدا کے عذاب کا شکار ہو جائے۔ نسل کی تربیت کے احساس کے ساتھ اپنے جیون ساتھی کی تلاش کا خیال پھر شدت سے ابھرتا ہے۔

میرے لئے اب رات یا دن کی کوئی اہمیت نہیں اس لئے کہ روشنی کا ہالہ اگر میرے ساتھ نہ ہو تو میرا دن بھی تاریک ہو جائے۔ جب بھی کہیں تھکن کا احساس ہوتا ہے ٹھہر جاتا ہوں، سستا لیتا ہوں۔ شاید نیند بھی کر لیتا ہوں یا صرف اونگھ لیتا ہوں۔ میں بدترین تباہی کے اس علاقہ سے تیزی سے نکلنے لگتا ہوں پتہ نہیں ان دہشت ناک مناظر کے خوف سے یا جیون ساتھی کی تلاش کے خیال سے جو پہلے سے زیادہ شدید ہو گیا ہے۔

جب میں اس علاقہ سے باہر آتا ہوں تو مجھے پہلی دفعہ احساس ہوتا ہے کہ میں نے کئی دنوں کی مسلسل مسافت کے باوجود کچھ کھایا پیا بھی نہیں۔ بھوک کا احساس بیدار ہو جائے تو اسے سلانا مشکل ہو جاتا ہے۔ بھوک کا احساس میرے جسم کے ساتھ ذہن اور روح پر بھی تھکن طاری کرنے لگتا ہے۔

میں چل رہا ہوں مگر مجھ سے چلا نہیں جاتا۔ میرا وجود شل ہونے لگتا ہے۔ میں اپنی بے بسی کے اقرار کے ساتھ خدا کی عظمت اور بزرگی کا اقرار کر کے اس کی تسبیح اور تحمید کرتا ہوں۔ تب ہی روشنی کے اس ہالے سے ایک کرن میرے جسم پر کسی تیر کی طرح اترتی ہے اور مجھ پر ہیبت طاری

ہوجاتی ہے،

''کیاانسان کومعلوم نہیں کہ ہم نے اس کوایک حقیر قطرہ سے پیدا کیا ہے۔ پھر وہ سخت جھگڑالو بن جاتا ہے اور ہماری ہستی کے متعلق باتیں بنانے لگ جاتا ہے اور اپنی پیدائش کو بھول جاتا ہے۔''

میں خدا کے جلال کے آگے جھک جاتا ہوں۔ لبوں سے یا دل سے کوئی دعا نہیں نکلتی۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی ایک جھڑی ہے جو تسبیح کے دانوں کی طرح ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہی ہے یہ آنسو اپنی بے بسی اور خدا کی عظمت کا خاموش اقرار ہیں۔

میں کتنی دیر تک اسی کیفیت میں سر بسجود رہتا ہوں جب دل کا بوجھ کسی حد تک اتر جاتا ہے تو سجدے سے سر اٹھاتا ہوں۔ بھوک کی شدت میں بڑی حد تک کمی ہوگئی ہے اور تھکن کا احساس بھی ایک حد تک زائل ہوگیا ہے۔ میں پھر اپنے سفر پر روانہ ہوتا ہوں۔ چلتے چلتے مجھے دور کہیں ہریالی کا گمان ہوتا ہے۔ میں بے ترتیب راستوں سے اس سمت چل پڑتا ہوں۔

یہ تو کوئی خاصا زرخیز علاقہ ہے۔ دور دور تک ہرے بھرے کھیت ہیں اور کھیتوں کے ساتھ ہی ایک خوبصورت سا باغ بھی ہے۔ باغ بڑے جدید انداز میں آراستہ ہے۔ درمیان میں ایک خوبصورت فوارہ بھی لگا ہوا ہے۔ اس خوبصورت باغ میں پہنچ کر تھکن تو دور ہوگئی مگر بھوک نے مزید شدت اختیار کر لی لیکن فوارے کے ٹھہرے ہوئے پانی میں مچھلیاں دیکھ کر میں ٹھٹھک گیا ہوں۔

کھیتوں کے ہرے بھرے راستے سے لے کر اس باغ تک مجھے کوئی ذی روح نظر نہیں آیا تھا۔ ذہن پر زور دیتا ہوں تو یاد آتا ہے راستے میں کچھ جانور مَرے پڑے تھے۔ مگر چونکہ میں اس سے زیادہ بھیانک تباہیوں سے گذر کر آیا تھا اس لئے میں نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کی تھی۔ اب مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ اس علاقہ پر زہریلی گیس کے بم پھینکے گئے تھے۔ تمام ذی روح مر چکے ہیں اور ساری فصلیں اور پھل زہریلے ہو چکے ہیں۔

روشنی کا وہ ہالہ بدستور اپنی کرنیں میرے جسم پر اتار رہا ہے۔ میں عجب گومگو کی حالت میں ہوں۔ بھوک اب اتنی شدت اختیار کر چکی ہے کہ مجھے لگتا ہے اگر میں نے کچھ نہ کھایا تو موت سے

نہیں بچ پاؤں گا مگر سارے پھل زہریلے ہو چکے ہیں

''مرنا ہی ہے تو بھوک کے پیٹ کیوں مرا جائے'' یہ سوچ کر بالآخر میں نے پھلوں کو توڑ توڑ کر کھانا شروع کر دیا ہے۔ مجھے کچھ ہوش نہیں میں کب تک پھل توڑ کر کھاتا رہا ہوں۔ ہوش تب آیا جب میں فوارے کا زہریلا پانی پی کر باہر آیا۔

اب میں اطمینان سے اپنی موت کا منتظر ہوں۔ مگر مجھے تو حیرت انگیز طور پر اپنے اندر توانائی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ روشنی کا ہالہ اب کتنی ہی کرنیں میرے جسم پر اتار رہا ہے،

''وہی ہے جو مایوسی کے بعد بارش اتارتا ہے اور اپنی رحمت کو پھیلا دیتا ہے''

''اے نفس مطمئنہ! اپنے رب کی طرف لوٹ آ۔ اس حال میں کہ تو اسے پسند کرنے والا بھی ہے اور اس کا پسندیدہ بھی۔''

میں ایک بار پھر خدا کے حضور سجدہ ریز ہو جاتا ہوں۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میں جہاں سے بچایا گیا ہوں وہاں کے تابکاری اثرات میرے اندر کچھ اس طرح سرایت کر چکے ہیں کہ وہ میری ہلاکت کی بجائے اس زہریلی گیس کی ہلاکت کا باعث بن گئے ہیں جو اس وقت موجود پھلوں اور پانی میں ہے۔ گویا وہ تابکاری اثرات اس طرح میری بقا کی ضمانت بن گئے ہیں۔ غالباً اسی لئے میں کتنے ہی متعفن مقامات سے گزرنے کے باوجود بیمار بھی نہیں ہوا اور یہ جو اتنی قوت مجھ میں آ گئی ہے کہ میں سینکڑوں میلوں کی مسافت طے کر کے یہاں تک آ پہنچا ہوں یہ بھی ان اثرات کے سبب سے ہی ہے۔ ''پس تم اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کا انکار کرو گے۔''

میں اپنی خوراک کے مسئلے سے اب بالکل مطمئن ہو جاتا ہوں۔ مجھے اب ان دو بڑی مشرقی اور مغربی قوتوں کے انجام کا خیال آتا ہے۔ دونوں قومیں ہی فتنے میں ایک دوسرے سے بڑھ کر تھیں۔ روشنی کا ہالہ میرے قریب آ جاتا ہے اور پھر کرن کرن میرے جسم پر اترنے لگتا ہے۔

یکا یک روشنی کا ہالہ پورے کا پورا میرے جسم پر اتر آتا ہے،

''تم پر آگ کا ایک شعلہ گرایا جائے گا اور تانبا بھی گرایا جائے گا پس تم دونوں ہرگز غالب نہیں آ سکتے اب بتاؤ کہ تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کا انکار کرو گے۔''

روشنی کا ہالہ پھر اپنے اصل فاصلے پر چلا جاتا ہے اور پھر کرن کرن میرے جسم پر اترنے لگتا ہے۔ میں دونوں بڑی قوتوں کی تباہی کا یقین کر لیتا ہوں۔

جیون ساتھی کی جستجو کا خیال پھر مجھے مستعد کر دیتا ہے۔ اور میں نیا آدم ہونے کے ناطے بقائے نسل انسانی کے مقدس فرض کی خاطر ایک نئے عزم کے ساتھ چل پڑتا ہوں۔

باغ والے اس گاؤں سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک شہر آباد ملتا ہے۔ ساری عمارتیں سلامت ہیں مگر شہر پر موت کی حکمرانی ہے۔ دوکانیں کھلی ہوئی ہیں مگر لوگ نیچے گرے ہوئے ہیں۔ کہیں دیواروں کے ساتھ لگے کھڑے ہیں بیشتر دوکاندار کاؤنٹر پر یوں سر رکھے ہوئے ہیں جیسے آرام کر رہے ہوں۔

مجھے بچپن کی وہ کہانی یاد آتی ہے جس میں ایک شہزادہ ایک ایسے شہر میں داخل ہوتا ہے جہاں ہر آدمی پتھر کا بت بنا ہوتا ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے میں بھی کوئی شہزادہ ہوں۔ مگر کہانی والے شہزادے کو اُس شہر کو زندہ کر دینے میں اس لئے آسانی ہوتی ہے کہ وہ کسی جادوگر کے طلسم کے باعث ویسا ہوا ہوتا ہے۔ جب کہ یہ شہر تو انسان کے اپنے ہی طلسم کا شکار ہو گیا ہے۔ زہریلی گیس کے بموں نے سارے شہر میں کوئی ذی روح نہیں چھوڑا۔

میں کسی تھکے ہارے، افسردہ شہزادے کی طرح ایک خوبصورت ڈیپارٹمنٹل سٹور میں داخل ہوتا ہوں۔ مگر ایک دم گھبرا کے پیچھے پلٹنے لگتا ہوں۔ سامنے کوئی وحشت زدہ آدمی کھڑا ہے۔ میں پیچھے ہٹتے ہوئے پھر رک جاتا ہوں۔ سامنے تو بڑا سا قد آدم آئینہ نصب ہے۔

''تو کیا.....؟ کیا.....یہ.....میں ہوں؟''

میں خود کو پہچاننے سے انکار کر دیتا ہوں۔ مگر بالآخر مجھے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ میں ہی ہوں۔ اپنی پہچان کو تسلیم کرتے ہی مجھے پہلی دفعہ اپنی برہنگی کا احساس ہوتا ہے۔ اسی اثنا میں آئینے میں مجھے بالکل اپنے ہی جیسی ایک وحشت زدہ عورت نظر آتی ہے۔ میں تیزی سے پلٹتا ہوں۔ اپنی تمام تر وحشت کے باوجود اس کا چہرہ بتا رہا ہے کہ وہ مغربی عورت ہے۔ اس کی آنکھوں میں تلاش اور تجسس ہے۔ وہ مجھے حیرانی سے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہے۔ پتہ نہیں اپنے باپ کو تلاش کر رہی

ہے، بھائی کو تلاش کر رہی ہے یا بیٹے کو.... اس کی آنکھوں میں یکا یک چمک پیدا ہوتی ہے۔ جیسے اس نے پہچان لیا ہو۔ اور پھر وہ دوڑ کر مجھ سے بُری طرح چمٹ کر سسکنا شروع کر دیتی ہے۔ میں نہیں جانتا اس نے مجھے باپ سمجھا ہے۔ بھائی سمجھا ہے۔ بیٹا سمجھا ہے یا کوئی اور۔ لیکن میں مطمئن ہوں کہ اب آدم کی نسل اس دھرتی سے ختم نہیں ہو گی۔

میرے ماضی اور مستقبل کی تحریریں میرے دائیں بائیں ادب کے ساتھ کھڑی ہیں۔

اور میرا ''برہنہ حال'' میرے برہنہ جسم سے چمٹا مشرق اور مغرب کی نفرتوں کو اپنے آنسوؤں سے صاف کر رہا ہے۔

روشنی کا ہالہ ہم دونوں کے جسموں سے گزر کر ہماری روحوں میں اتر جاتا ہے اور ہم دونوں کے اندر سے ایک خوبصورت آواز ابھرتی ہے،

''اب بتاؤ کہ تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کا انکار کرو گے۔''

☆☆☆

گلاب شہزادے کی کہانی

ہوا شہکار جب اس کا مکمل
وہ اپنے خون میں ڈوبا ہوا تھا

بے انت پھیلے ہوئے صحرا میں جب رات کا ایک پہر گزرنے کے باوجود کسی کو نیند نہ آئی تو چاروں درویش اٹھ کر بیٹھ گئے۔ پہلے درویش نے تجویز پیش کی کہ رات کاٹنے کے لئے اپنی اپنی کوئی کہانی سنائی جائے۔ سب نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور پہلے درویش سے کہا کہ وہ خود اپنی زندگی کی کسی کہانی سے ابتدا کرے۔

لمبے بالوں والا پہلا درویش آگے کو جھکا اور پھر یوں گویا ہوا:

''میری کہانی گلاب شہزادے کی کہانی ہے۔

گلابی رنگ کو تم بخوبی پہچانتے ہو۔ خون سرخ رنگ کا ہوتا ہے۔ خون میں سفید رنگ ملا دیں تو وہ گلابی بن جاتا ہے لیکن اگر خون ویسے ہی کہیں جم جائے تو سیاہ ہوجاتا ہے۔ خیر تو میں کہہ رہا تھا..میری کہانی گلاب شہزادے کی کہانی ہے۔لیکن اس کے لئے مجھے عملاً بتانا پڑے گا''

یہ کہہ کر پہلے درویش نے اپنے تھیلے سے گلاب کی ایک قلم نکالی اور اسے ریت میں گاڑ دیا۔

''میری کہانی کا باقی حصہ اس قلم کے بڑھنے تک ادھورا رہے گا۔ اس لئے بہتر ہے کہ آپ لوگ

باری باری اپنی کہانیاں سنالیں.....میں آخر میں اپنی کہانی مکمل کروں گا۔''

پہلے درویش کی اس بات پر دوسرے درویش نے اپنی کہانی شروع کی:

''میری کہانی عام سی ہے۔ میری بیوی نے اپنی آنکھوں کے جادو اور ہونٹوں کے منتر سے مجھے گدھا بنا دیا تھا اور میں کئی صدیوں سے بوجھ اٹھاتا چلا آرہا تھا۔ پھر ایک دن مجھے بھی ایک اسم مل گیا۔ میں گدھے سے انسان بن گیا اور تب میں نے اپنے اسم کے زور سے اپنی بیوی کو گھوڑی میں تبدیل کر دیا۔''

تیسرا اور چوتھا.....دونوں درویش اس کی کہانی بڑی دلچسپی سے سن رہے تھے جبکہ پہلا درویش گلاب کی اس قلم کو دیکھ رہا تھا جس کے ارد گرد چھوٹے چھوٹے کانٹے سے چپکے ہوئے تھے....قلم آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔

''اب مجھے صحیح طور پر یاد نہیں رہا کہ پھر میں نے اسے تانگے میں جوت دیا تھا، گھوڑ دوڑ کے کلب میں لے گیا تھا یا ویسے ہی اسے سرپٹ دوڑاتا رہا.... یا پھر پتہ نہیں وہ خود ہی سرپٹ دوڑتی رہی....دوڑتی رہی......''

''پھر کیا ہوا؟''

تیسرے اور چوتھے درویش نے بڑے اشتیاق اور تجسس سے پوچھا۔

پہلا درویش ابھی تک گلاب کی اس بڑھتی ہوئی قلم کو دیکھ رہا تھا۔

''پھر؟'' دوسرے درویش نے ذہن پر تھوڑا سا زور دیا۔

''پھر...جب میری بیوی اپنی پہلی تنخواہ لائی تھی تو اس کا چہرہ خوشی سے گلنار ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی آدھی تنخواہ گھر کے اخراجات میں ڈال دی اور بقیہ آدھی بچوں کے مستقبل کے لئے بنک میں جمع کرادی اور پھر ہمیشہ ہی اس کا یہی طریق رہا۔ میری اور اس کی تنخواہ سے ہمارا گھر خاصا خوشحال ہوگیا۔ البتہ وہ اپنے باس کی بہت تعریفیں کرتی رہتی تھی۔ وہ اس کا ضرورت سے زیادہ ہی خیال رکھتے تھے''۔

اچانک دوسرے درویش کی نظر گلاب کی اس قلم پر پڑی جو اس عرصے میں حیرت انگیز طور

پر دو گنی ہو چکی تھی اور اب اس میں ننھے ننھے سبز پتے بھی پھوٹ رہے تھے۔ اسے یوں لگا جیسے کانٹوں میں لپٹی ہوئی گلاب کی پوری قلم کسی نے اس کے حلق میں ٹھونس دی ہو۔

اس نے ایک جھرجھری سی لی اور پھر بے اختیار پکارا۔ ''پانی.....!''

پہلے درویش نے جلدی سے پانی کا کوزہ اس کے منہ سے لگا دیا۔

گلاب کی قلم کچھ اور سرسبز ہوگئی اور سبز پتوں کے ساتھ ایک سرخ پتہ بھی ابھر آیا دوسرے درویش نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا اور دم توڑ دیا۔

باقی تینوں درویشوں نے دیکھا کہ بے انت پھیلے ہوئے صحرا نے خود کو خاصا سمیٹ لیا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔رات کا دوسرا پہر گزر چکا تھا۔

تیسرے درویش نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنی کہانی شروع کی:

''جیسا کہ آپ جانتے ہیں تاریخ اور جغرافیے سے مجھے گہری دلچسپی ہے اور مرا تعلق بھی آثارِ قدیمہ سے ہے.....تین بچوں کی پیدائش کے بعد میری بیوی نے مجھے مشورہ دیا کہ میں خاندانی منصوبہ بندی پر عمل کروں۔ چنانچہ میں نے غبارے استعمال کرنا شروع کر دیئے.... مرا گھر خاصا چھوٹا اور تنگ سا ہے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ استعمال کے بعد میں نے غبارہ نالی میں پھینکنے کی بجائے کونے میں پڑی بڑی میز کے پیچھے پھینک دیا۔ میز کے نیچے پڑے ڈھیر سارے کباڑ میں وہ غبارہ چھپا رہتا۔ پھر کبھی خیال آتا تو اسے اٹھا کر نالی میں پھینک دیتا۔''

چوتھا درویش اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''ایک دفعہ کسی کھنڈر سے کئی ہزار سالہ پرانی کھوپڑی دریافت ہوئی تو اس کے مطالعہ کے لئے مجھے بلایا گیا۔ کھوپڑی کے مطالعہ کے بعد جب میں گھر آیا تو اپنی میز کے نیچے کباڑ میں سے کوئی چیز ڈھونڈتے ہوئے مجھے ایک سوکھا ہوا مڑا تڑا سا غبارہ مل گیا۔ میں نے اسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا.... یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کھوپڑی اس غبارے میں موجود ہو اور وہ کھوپڑی مرے اپنے بیٹے کی ہو''

چوتھا درویش اس کی کہانی میں خاصی دلچسپی لے رہا تھا۔

پہلا درویش گلاب کی اس مسلسل بڑھتی ہوئی قلم کو دیکھ رہا تھا جس میں سے اب شاخیں بھی پھوٹنے لگی تھیں۔

''میں خوف سے کانپ اٹھا۔ مجھے لگا میں نے اپنے بیٹے کو قتل کر کے اس کے سر کو محض کھوپڑی بنا دیا ہے۔ میں نے اپنی بیوی کو اپنا خوف بتایا۔ پہلے تو اس نے شور مچا دیا ''خاندانی منصوبہ بندی ختم نہیں کرنے دوں گی۔ مری صحت پھر تباہ ہو جائے گی'' لیکن بالآخر مرا خوف اس کی ضد پر غالب آ گیا۔

جس دن اس نے مجھے خوشخبری سنائی.... مجھے یوں لگا جیسے ہزاروں برس پہلے کھو جانے والی مری کوئی قیمتی چیز مجھے دوبارہ ملنے والی ہے۔''

تیسرے درویش کی نظر گلاب کی اس قلم کی طرف اٹھ گئی جو اَب گلاب کے چھوٹے سے پودے میں ڈھل گئی تھی۔

اسے یوں لگا جیسے گلاب کا پودا اس کے اندر ہے اور کوئی اُسے اُس کے حلق سے باہر کھینچ رہا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔وہ خوف سے چلّایا: ''پانی....!''

پہلے درویش نے جلدی سے پانی کا کوزہ اس کے منہ سے لگا دیا۔

گلاب کا پودا کچھ اور پھیل گیا اس کے سبز پتوں میں ایک اور سرخ پتہ ابھر آیا۔

تیسرے درویش نے خوفزدہ آنکھوں سے یہ منظر دیکھا اور دم توڑ دیا۔

باقی دونوں درویشوں نے دیکھا کے بے انت پھیلے ہوئی صحرا نے خود کو آدھا سمیٹ لیا ہے، رات کا تیسرا پہر گزر چکا تھا۔

چوتھے درویش نے مشکوک نظروں سے پہلے درویش کو دیکھا اور قدرے چوکنّا ہو کر اپنی کہانی بیان کرنے لگا:

''یہ کہانی دراصل میری نہیں۔ میرے ایک دوست کی ہے۔ میں اسے اسی کی زبان میں

بیان کروں گا''

چوتھے درویش نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''مرا بھائی گہری نیند سویا ہوا تھا میں اس کے کمرے میں بیٹھا کوئی کام کر رہا تھا۔اچانک میں نے دیکھا کہ مرے بھائی کی ناک سے شہد کی ایک مکھی نکلی.....قریب ہی پانی کا ایک ٹب پڑا تھا۔جس میں لکڑی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا تیر رہا تھا جو شاید کسی بچّے نے ڈال دیا تھا....شہد کی مکھی اڑ کر لکڑی کے اُس ٹکڑے پر جا بیٹھی۔کچھ دیر بعد پھر اُڑی اور مرے بھائی کی ناک میں داخل ہوگئی....میں یہ منظر بڑی حیرت سے دیکھ رہا تھا''۔

''اچھا۔پھر کیا ہوا؟؟'' پہلے درویش کی مسکراہٹ بڑی سفّاک تھی، وہ اب بھی گلاب کے اُس پودے کو دیکھ رہا تھا جو مسلسل پھلتا پھولتا جا رہا تھا۔

''پھر۔۔پھر۔۔'' چوتھا درویش خوفزدہ انداز میں اِدھر اُدھر دیکھ کر بولا:

''پھر میرا بھائی بیدار ہوگیا۔اس نے اپنا ایک حیرت انگیز خواب سنایا....اس نے بتایا کہ وہ کسی دریا کے کنارے کھڑا تھا کہ لکڑی کا ایک بڑا سا تختہ تیرتا ہوا اس کے قدموں میں آ گیا، وہ اس پر سوار ہوگیا۔جب وہ تختہ اسے دوسرے کنارے پر لے گیا تو اس نے دیکھا کہ وہ جگہ خزانوں سے بھری پڑی ہے۔مگر وہ اکیلا یہ خزانے نہ اٹھا سکتا تھا، اس لئے دوسرے ساتھیوں کو لینے کے لئے واپس آ گیا''

''حیرت ہے.....حیرت ہے!'' پہلا درویش بڑے مکّارانہ انداز میں بولا۔اس کی نظریں اب بھی گلاب کے اس پودے پر گڑی تھیں جو اَب بڑی شان سے لہلہا رہا تھا، چوتھا درویش گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا:

''میں بھائی کا خواب سمجھ گیا۔میں نے اسے قتل کر دیا اور وہ جگہ جہاں ٹب پڑا تھا اور شہد کی مکھی لکڑی کے ٹکڑے پر تیرتی رہی تھی، اسے کھود ڈالا....وہاں واقعی خزانے تھے....مگر.....مگر......''

''مگر کیا؟'' پہلے درویش کے لہجے میں تشویش کی ہلکی سی پرچھائیں ابھری۔

چوتھے درویش کی نظریں اس لہلہاتے ہوئے گلاب کے پودے پر پڑیں۔

اور پھر وہی کیفیت.....

''پانی.....!''

پہلے درویش نے جلدی سے پانی کا کوزہ اس کے منہ سے لگا دیا۔مگر چوتھے درویش نے کوزہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔پانی پیا۔

پھر گلاب کے پودے میں ایک اور سرخ پتے کو ابھرتے ہوئے دیکھا۔

خوف سے جھرجھری لی۔

''مگر کیا.....؟'' پہلے درویش نے اسے جھنجھوڑ کر پوچھا۔

''مگر.....یہ کہانی مرے دوست کی نہیں.....مری اپنی ہے.....اپنی....'' اور پھر چوتھے درویش نے بھی دم توڑ دیا۔

سارے صحرا نے خود کو سمیٹ کر پہلے درویش کے قدموں میں ڈال دیا۔

رات کا آخری پہر گزر چکا تھا۔

پو پھوٹ رہی تھی۔

پہلے درویش کے وحشیانہ قہقہے صحرا میں گونجنے لگے۔

''ہاہاہا.....اب اس صحرائی علاقے کی تیل کی دولت کا میں تنہا مالک ہوں۔ایٹمی جنگ میں جتنے لوگ بھی بچ گئے ہوں گے سب مری رعایا ہیں.....اور میں اس نئے عہد کا حکمران.....عظیم حکمران.....ہاہاہا.....''

اچانک اسے شدید پیاس کا احساس ہوا۔اس نے کوزے کو دیکھا۔کوزہ خالی ہو چکا تھا۔وہ گھبرا گیا۔اور پھر پانی کی تلاش میں اِدھر اُدھر دوڑنے لگا۔

وہ دوڑتا رہا.....دوڑتا رہا.....

اور سمٹا ہوا صحرا پھیلتا رہا.....پھیلتا رہا.....

سورج نصف النہار تک پہنچ گیا۔

اس کے سامنے تیل کے چشموں کا ذخیرہ تھا، کنووں کی بجائے چشمے!

مگر پانی؟۔۔۔۔۔

پیاس کی شدّت،

شدید تھکاوٹ،

اور مسلسل پھیلتا ہوا صحرا

وہ تیل کے چشمے پر ہی پیاس بجھانے کے لئے جھک گیا۔

☆☆

اس کا آدھا جسم باہر پڑا تھا۔ سر پانی کے چشمے میں ڈوبا ہوا تھا۔ پھیلی ہوئی بانہیں آدھی سے زیادہ چشمے میں اور باقی باہر اور..... لمبے لمبے بال پانی میں لہراتے تیر رہے تھے۔

اس کی مردہ آنکھیں بھی پانی کے چشمے کو تیل کا چشمہ سمجھ رہی تھیں۔

گلاب کے پودے پر ایک بڑا سا پھول اُگ آیا تھا۔

گلاب کے اس پھول کا رنگ غیر معمولی حد تک گہرا سیاہ تھا۔

گلاب شہزادے کی کہانی مکمل ہو چکی تھی۔

مگر نہ کوئی اسے سنانے والا تھا، نہ سننے والا!

☆☆☆

کاکروچ

اگلی نسلوں میں چلی جائے روانی اپنی

زندگی! ختم نہیں ہوگی کہانی اپنی

''ایٹمی جنگ کے متوقع خطرات کے پیشِ نظر میں نے ایٹمی جنگ کے بعد کے انسان کے حوالے سے ایک کہانی سوچی ہے۔''

نصیر حبیب نے میری بات کو دلچسپی سے سنا اور کہا: ''کہانی کا خیال سناؤ''۔ لیکن اسی دوران مسعود شاہ بول اُٹھا۔ ''یار! تم اب تک اسی موضوع پر پہلے ہی دو کہانیاں لکھ چکے ہو۔ اس موضوع کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟ لگتا ہے ایٹمی جنگ کرا کے ہی رہو گے''۔ مسعود شاہ اپنے مزاج کے لاابالی پن کے باعث جو منہ میں آئے بول دیتا ہے۔

''کہانی کا خیال سناؤ!'' نصیر حبیب نے پھر پہلے لہجے میں کہا۔

''چلو یار! اب کہانی سنا بھی چکو'' مسعود شاہ نے بےزاری کے ساتھ جیسے نصیر حبیب کا ساتھ دیا۔

''اس کہانی کا آغاز ایٹمی جنگ کے بعد کے انسان سے ہوتا ہے۔ میں اور ایک عورت اس جنگ میں معجزانہ طور پر بچ گئے ہیں۔ چنانچہ ہم دونوں مل کر اس زمین پر آدم اور حوا کی نئی کہانی شروع کرتے ہیں۔ میں نہ صرف صاحبِ اولاد ہو گیا ہوں بلکہ میری اولاد بھی صاحبِ اولاد ہو گئی

ہے۔تاہم کرۂ ارض پر ہماری حالت ایسے ہی ہے جیسے انسان ابھی ابھی غار کے زمانے سے نکل کر جنگل میں جھونپڑے بنا رہا ہے۔ میرے پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں نہیں جانتے کہ انسان کیسی عظیم تر ترقیات کے دور سے نکل کر جنگل کے دور میں آ گیا ہے‘‘

میں دیکھتا ہوں کہ نصیر حبیب ہی نہیں مسعود شاہ بھی میری کہانی کو سنجیدگی سے سن رہا ہے۔

’’ایک دن میرے پوتوں، پوتیوں نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں انہیں عام معمول سے ہٹ کر کوئی انوکھی سی کہانی سناؤں۔ تب میں انہیں اپنے ترقی یافتہ دور کے حالات بتانے لگتا ہوں۔

’میرے پیارے بچو! یہ کہانی نہیں حقیقت ہے۔ اس کے باوجود کہانی سے زیادہ دلچسپ اور المناک ہے۔ آج سے چند عشرے پہلے سارے دنیا ہم جیسے انسانوں سے بھری ہوئی تھی۔ انسان کو دنیا میں ہر طرح کی نعمتیں میسر تھیں۔ سفر پر جانا ہو تو کار سے لے کر ہوائی جہاز تک کی سہولتیں موجود تھیں‘

’دادا ابو! یہ کار اور ہوائی جہاز کیا ہوتے تھے؟‘

میری پوتی نے سوال کیا تو مجھے وضاحت کرنا پڑی کہ کار ایک سواری تھی جس میں چار پانچ آدمی بیٹھ جاتے۔ اسے صرف ہینڈل کرنا ہوتا تھا وہ خود ہی سواریوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی۔ یہاں سے دریا کے کنارے تک کا جو فاصلہ ہم آدھے دن میں طے کرتے ہیں۔ کار ہمیں پل بھر میں وہاں پہنچا دیتی تھی۔ بچوں کے چہروں سے تجسس اور دلچسپی ظاہر ہو رہی تھی۔

’اور دادا ابو۔۔۔ ہوائی جہاز؟‘۔ میرے پوتے نے پوچھا۔

’ہوائی جہاز بہت بڑا ہوتا تھا۔ اس میں کئی سو افراد بیٹھ جاتے تھے تو وہ انہیں اتنی دور تک پہنچا دیتا جتنی دور تم اپنی ساری زندگی میں بھی نہیں جا سکو گے۔ اور ہاں۔۔۔ ہوائی جہاز پرندوں کی طرح اُڑ کر جاتا تھا۔ دریاؤں اور پہاڑوں کے بھی اوپر سے گزر جاتا تھا‘

میری بات سن کر بچے کھلکھلا کر ہنس پڑتے ہیں۔

’دادا ابو اور کیا ہوتا تھا آپ کے زمانے میں؟‘ اس بار میرے پوتے کے لہجے میں شرارت کی چمک تھی۔

میں نے ایک لمبا سانس لیا اور پھر بتانے لگا ’اُس زمانے میں ریڈیو، ٹیلی ویژن، ٹیلی فون،

فیکس، کمپیوٹر۔۔۔‘

’دادا ابو! یہ ریڈیو کیا ہوتا تھا؟‘

’یہ ایک چھوٹا سا بکس ہوتا تھا۔ اس کے بٹن گھمانے سے کبھی گیت سنائی دیتے۔ کبھی ساری دنیا کی خبریں، کبھی لوگوں کی گفتگو‘

’اور ٹیلی ویژن؟‘

’ریڈیو والی ساری چیزیں ٹیلی ویژن پر سنائی بھی دیتی تھیں اور دکھائی بھی دیتی تھی۔ یعنی اگر کوئی آواز آرہی ہے تو اس کا چہرہ بھی دکھائی دیتا اور وہ شخص ہماری طرح ہی چلتا پھرتا اور بولتا نظر آتا تھا‘

ننھے منے معصوم بچوں نے میری بات سن کر اتنے زور سے قہقہے لگائے کہ میں خفیف سا ہو گیا۔ وہ مجھ سے پہلے زمانے کی اور دلچسپ باتیں سننا چاہتے ہیں مگر میں کہتا ہوں۔ پیارے بچو! میں اب تھک گیا ہوں اس لیے باقی باتیں کل سناؤں گا۔

پھر میں ان کے جھونپڑے سے نکل آتا ہوں۔ جھونپڑے سے باہر آکر یونہی خیال آیا اور میں رُک کر بچوں کی آوازیں سننے لگا۔ میرا ایک پوتا کہہ رہا تھا: ’دادا ابو زیادہ بوڑھے ہو گئے ہیں اس لئے اچھی اچھی کہانیوں کو اپنے زمانے کے واقعات سمجھنے لگ گئے ہیں‘

میرے باقی سارے پوتے پوتیاں اس کے تبصرے کی تائید میں ہنس رہے تھے‘‘

میں نے کہانی ختم کی تو مسعود شاہ نے زوردار قہقہہ لگایا۔ ’’یار! اگر جنگ میں صرف تم اور ایک عورت ہی بچتے ہو تو بچوں کی شادیاں کیسے کیں؟ کیا پھر بہن بھائیوں کی شادیاں کرادیں؟‘‘

’’اگر آپ کو اس میں الجھن محسوس ہوتی ہے تو جنگل کے قریب دریا کے کنارے پر ایک اور مرد، عورت بھی جنگ سے بچا دیتا ہوں‘‘ میں نے وضاحت کی۔

’’یہ چھوٹی چھوٹی باتیں تو کہانی لکھتے وقت خود اپنی راہ بناتی جائیں گی۔ میں ایک اور اہم مسئلے کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں‘‘ نصیر حبیب نے سنجیدگی سے کہا ’’ایٹمی جنگ کے بعد سطح زمین

پر کسی انسان کا زندہ بچ رہنا سائنسی طور پر ممکن نہیں۔ اس لئے بچ رہنے والوں کو آپ کس بنیاد پر بچا رہے ہیں؟''

''میری کہانی بنیادی طور پر فکشن ہے، اسے آپ سائنسی مضمون تو نہ سمجھیں'' میں نے نصیر حبیب کے اعتراض کے جواب میں کہا۔

''میں تو فکشن کی اہمیت کا معترف ہوں'' نصیر حبیب نے متانت سے کہا۔'' بلکہ میرے نزدیک سائنس کی بنیاد بھی فکشن پر ہے۔ ہر نیا سائنسی انکشاف پہلے فکشن ہوتا ہے۔ اس لئے میں نے جو نکتہ اٹھایا ہے پہلے مجھے اس کی تفصیل بیان کر لینے دیں۔''

میں تو نصیر حبیب کی تفصیل سننے کے لئے ہمہ تن گوش تھا ہی۔ مسعود شاہ بھی خلاف توقع سنجیدہ ہو گیا تھا۔

''سطح زمین پر ایٹمی جنگ کی صورت میں کوئی ذی روح مخلوق زندہ نہیں رہ سکتی۔ صرف وہ مخلوق زندہ رہ سکتی ہے جس میں Nuclear Poison ہو۔ کیونکہ صرف یہی Element ہر قسم کی تابکاری کو جذب کر سکتا ہے۔ مثلاً Lead ہر قسم کی تابکاری کو جذب کر سکتا ہے لیکن اگر انسانی خون میں Lead شامل ہو تو پھر اسے ہلاک کرنے کے لئے ایٹمی جنگ کی بھی ضرورت نہیں، انسان ویسے ہی مر جائے گا''

''آپ کا مقصد یہ ہے چونکہ انسانی خون شریانوں میں ہوتا ہے اس لیے اس کی موت واقع ہو جائے گی لیکن بعض ذی روح ایسے ہیں کہ ان کے ہاں شریانوں والا سسٹم نہیں ہے مثلاً مکھی کے جسم میں خون کی الگ تھیلی ہوتی ہے، اس لئے اگر اس کے جسم میں Nuclear Poison ہو تو اس کی موت واقع نہیں ہو گی''

میری بات سن کر نصیر حبیب کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔'' آپ کی کہانی اب بنے گی۔ مکھی کی جگہ کاکروچ لے لیں۔ فرض کر لیں کہ کاکروچ کے وجود میں بھی ایسا سسٹم ہے کہ تابکاری اثرات اسے نقصان نہیں پہنچا سکتے بلکہ الٹا اس کی Growth کرتے ہیں۔ لہٰذا ایٹمی جنگ کے بعد سارے ذی روح مر جائیں گے سوائے کاکروچ کے۔ اور تابکاری اثرات سے جب ان

کی Growth ہو گی تو آنے والے زمانے میں اس زمین کے حکمران اور مالک یہی کاکروچ ہوں گے جو انسانی قد کے برابر ہو جائیں گے''۔

نصیر حبیب کی کہانی سن کر مسعود شاہ نے زوردار قہقہہ لگایا۔

''ٹھہریں!'' میں نے ہاتھ اٹھا کر سنجیدگی سے کہا'' کہانی تو ہزاروں سال پہلے بن چکی ہے''

نصیر حبیب نے مجھے الجھے ہوئے انداز سے دیکھا۔

''دوستو! ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہم آج کے انسان ہزاروں سال پہلے کے کسی زمانے کے کاکروچ ہوں''

''کیا؟''

نصیر حبیب اور مسعود شاہ کی آوازوں میں گھبراہٹ تھی،

اور پھر وہ اس طرح اپنے آپ کو دیکھنے لگے جیسے واقعی کسی پرانے زمانے کے کاکروچ ہوں۔

☆☆☆